عہدِ صحابہؓ کے فقہی اصول

(از محمد معروف دوالیبی ایل ایل ڈی (پیرس یونیورسٹی) شام

کتاب و سنت کی تکمیل | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت سے تین ماہ پہلے حجۃ الوداع کے موقع پر تقریباً ایک لاکھ نفوس جمع ہوئے۔ یہ انبوہِ کثیر آپؐ نے خود طلب فرمایا تھا۔ اس اجتماعِ عظیم کے عین وسط میں، جو عہد نبوت میں پہلی بار اتنی بڑی تعداد میں وجود میں آیا تھا، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ یہ آیت قرآن کا آخری ارشاد ہے جو حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوا اور جس نے صفحاتِ قرآن پر مہرِ اختتام ثبت کر دی۔ بعض صحابہ کا ماتھا اسی وقت ٹھنکا کہ اس آیت میں صاحبِ شریعت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے لیے واپسی کا بلاوا ہے، کیونکہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ آپؐ کی مہم پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے اور آپ کا فریضۂ رسالت پورا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان کا یہ خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ اس آیت کے نزول کو ابھی تین ماہ ہی گذرے تھے کہ آپ کی دنیوی زندگی کے ایام مکمل ہو گئے اور اپنے رفیقِ اعلیٰ کے پاس تشریف لے گئے۔ صفحاتِ قرآن پر تو تین ماہ پیشتر ہی مہرِ اختتام لگ چکی تھی لیکن اب صفحاتِ سنت پر بھی خاتمہ کی لکیر کھنچ گئی۔

اجتہادِ صحابہ کی تین بنیادیں | نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات مبارک سے شریعت کے دونوں بنیادی ماخذ مکمل ہو گئے اور کسی نئے حکم کے اضافہ کا سوال باقی نہ رہا۔ لیکن لوگ برابر نو بہ نو مسائل اور غیر مالوف حوادث سے دوچار تھے۔ اب ان کے لیے ناگزیر ہو گیا کہ جدید مسائل و حوادث پر جب انہیں کتاب و سنت سے کوئی نص نہ دستیاب ہو تو بالآخر اجتہاد کی پناہ لیں۔ چنانچہ انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا اور اس باب میں انہوں نے اولاً قرآن و سنت کے مماثل احکام پر اعتماد کیا، ثانیاً احکامِ قرآن و سنت کی رُوح —— جس سے ان کا ذوق و فہم پوری طرح آشنا تھا —— پر استناد کیا۔

اور ثالثاً اس شائع و ذائع نظریے کو مدنظر رکھا کہ: ما رآہ المسلمون حسناً فھو عند اللہ حسن (مسلمان جس چیز کو مستحسن سمجھیں اللہ کے نزدیک بھی وہ مستحسن ہے) اور یہ کہ "ان المصلحۃ حیثما وجدت فثم شرع اللہ" (شریعتِ الٰہی کے احکام مصلحت پر مبنی ہیں)۔

توسیع اجتہاد کے دو عوامل الغرض یہ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت وہ پہلا عامل تھی جس نے اجتہاد کو ایسے مرحلے میں داخل کر دیا جہاں اس کی اہمیت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی اور جہاں سابق کی نسبت اُس کا زیادہ سہارا لیا جانے لگا۔ اس عامل کے متصلاً بعد ایک اور عامل نمودار ہوا جس نے اجتہاد کی توسیع و ترقی میں مزید اضافہ کر دیا۔ یہ اسلامی فتوحات کی برق رفتاری تھی جو مشرق سے لے کر مغرب تک قدیم دنیا کے بہت بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لیے چلی آرہی تھی۔ اور جس کے نتیجے میں عربوں کو بکثرت ایسے طرز حیات سے واسطہ پڑ رہا تھا جس کے اقتصادی اور اجتماعی نظام کے بعض پہلو جزیرہ نمائے عرب کے نظام سے مختلف نوعیت کے تھے۔ چنانچہ مسلمان نئے قانونی مسائل و مقدمات سے دوچار ہونے لگے، جن کے بارے میں قرآن و سنت نے صراحتاً یا اشارۃً کوئی رہنمائی نہیں کی تھی۔ اب مسلمانوں کے اہل علم و بصیرت کا فرض تھا کہ وہ شریعت کے واضح احکام سے جدید مسائل کی تخریج کریں اور اجتہاد کے ذریعے سے ان کے شرعی پہلو دریافت کریں۔

اجتہاد کے دائرہ کار میں غیر معمولی پھیلاؤ جیسا کہ ہم پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اجتہاد اپنے قواعد و اصول کے لحاظ سے بھی اور اپنے دائرہ عمل کے لحاظ سے بھی محدود پیمانے پر تھا۔ اس کا استعمال شخصی اور انفرادی حقوق سے متجاوز نہیں ہوا۔ بلکہ ان حقوق میں بھی وہ صرف باہمی لین دین کے مسائل ہی میں جاری رہا۔ البتہ عہدِ نبوت کے بعد، عہد صحابہ میں یہ اپنی حدود سے کئی پہلوؤں سے ترقی کر گیا۔ اوّلاً اس کے دائرہ عمل میں تمام شخصی حقوق مثلاً عائلی حقوق، احکام عقود و التزامات (CONTRACTS AND CONDITIONS) اور فوجداری قوانین آئے اور پھر اسی اہتمام و اعتناد کے ساتھ بلکہ اس سے وسیع الاثر اور عظیم الشان صورت کے ساتھ تمام ملکی حقوق مثلاً بنیادی شہری حقوق، قوانینِ نظم مملکت اور بین الاقوامی ضوابط کو اپنے احاطۂ کار

میں لے لیا۔ جونہی کوئی ایسا قضیہ ابھرتا جو ریاستی معاملات سے یا مصلحتِ عامہ سے تعرض کرتا فوراً اجتہاد حرکت میں آتا اور نظامِ قانون میں بکثرت ایسے نئے اصول و مبادی پیش کر دیتا جو مصلحت عامہ کے تحفظ اور ریاست کی حفاظت کے لیے ناگزیر ہوتے تھے۔

اجتماعی قوانین میں خلفائے راشدین کی بلند نظری | ملکی قوانین کے باب میں خلفائے راشدین نے ایسے مثالی کارنامے سرانجام دیئے ہیں جو انسانی تاریخ کا نقشِ دوام بن چکے ہیں اور جن کے چرچوں سے ہر دَور گونجتا رہے گا۔ ان قوانین میں جو بلند ترین تصور پیش کیا گیا ہے آج ہمیں اس ترقی یافتہ بین الاقوامی سوسائٹی میں بھی کوئی ایسا ذہن نہیں نظر آتا جو اس تصور تک رسائی حاصل کر سکا ہو یا کم از کم اس طرز پر قانون سازی کے لیے آپنے آپ کو اجازت دینے کے لیے تیار ہو۔ مثلاً ان خلفائے کرام نے بنیادی حقوق کے ضمن میں ہر شہری کے لیے سیاست اور اجتماع میں حریت و مساوات کا حق تسلیم کیا ہے۔ بلکہ اُسے اس قدر مقدس حق گردانا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب اسی حق کے متعلق ایک مقدمہ آیا تو آپ نے فرمایا: "منذ کم استعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احراراً (تم نے کب سے انسانوں کو غلام بنانا شروع کیا ہے حالانکہ اُن کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تنہا یہی قول بنیادی حقوق کے موضوع پر ایک حیرت انگیز مثال کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور انسانی مساوات کی تاریخ میں اس پر مہرِ دوام ثبت ہو چکی ہے۔

عہدِ صحابہ کے مجتہدین اور اہلِ فتویٰ | صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے اہلِ فتویٰ حضرات کی بہت بڑی تعداد نے شہرت حاصل کی ہے۔ ان میں سے بعض حضرات وہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دائمی مصاحبت اور آپ سے احکام دین کے اخذ کرنے میں شہرت رکھتے ہیں، اسی لیے وہ فتویٰ طلب کرنے والوں کا مرجع اور اربابِ قضایا کا مرکز بنے رہے ہیں۔ اہلِ فتویٰ صحابہ کی مجموعی تعداد ایک سو تیس کے قریب ہے جس میں مرد اور عورتیں اور کثیر الفتویٰ، متوسط الفتویٰ اور قلیل الفتویٰ سبھی شامل ہیں[1]۔

---

[1] اعلام الموقعین از ابن قیم، جزء اول، ص ۱۳۔ مطبعۃ النیل، مصر

اس پوری تعداد میں سے سات حضرات سرفہرست ہیں :

۱۔ حضرت عمر بن خطاب، جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ثانی ہیں۔

۲۔ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ، جو آپ کے چچازاد بھائی اور داماد اور آپ کے چوتھے خلیفہ ہیں۔

۳۔ اُمّ المومنین سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، رسولِ خدا کی زوجہ مطہرہ۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، جو کوفہ میں فقہ کے معلّم اوّل کہلاتے ہیں اور جن کی جانب عراق کے اہل الرائے گروہ کا مسلک منسوب ہے۔

۵۔ حضرت زید بن ثابت، جو قوانینِ وراثت کے اسپیشلسٹ شمار ہوتے ہیں۔

۶۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، رسولِ اکرمؐ کے چچیرے بھائی

۷۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما۔

ابو محمد بن حزم فرماتے ہیں: "فقہائے سبعہ کے فتاویٰ سے ایک ضخیم دفتر جمع کیا جا سکتا ہے انہی کا بیان ہے کہ ابوبکر محمد بن موسیٰ ابن یعقوب بن امیر المومنین المامون نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے فتاویٰ کو جمع کیا تو ان کی بیس جلدیں تیار ہوئیں"[1]

فقہائے سبعہ کے بعد ذیل کے بیس صحابہ کا نمبر آتا ہے جو متوسط الفتویٰ ہیں۔

۱۔ ابوبکر صدیقؓ ۔ ۲۔ ام سلمہؓ زوجۂ رسول مقبول، ۳۔ انس بن مالکؓ، ۴۔ ابوسعید خدری ۔ ۵۔ ابوہریرہؓ ۶۔ عثمان بن عفانؓ، ۷۔ عبداللہ بن عمرو ابن العاص، ۸۔ عبداللہ ابن الزبیرؓ، ۹۔ ابوموسیٰ اشعری، ۱۰۔ سعد بن ابی وقاص، ۱۱۔ سلمان فارسیؓ، ۱۲۔ جابر بن عبداللہؓ ۱۳۔ معاذ بن جبلؓ، ۱۴۔ طلحہؓ ۱۵۔ زبیرؓ، ۱۶۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ، ۱۷۔ عمران ابن حصینؓ، ۱۸۔ ابوبکرہؓ، ۱۹۔ عبادہ بن الصامتؓ ۲۰۔ معاویہ بن ابی سفیان۔

ان حضرات میں سے ہر ایک کے فتاویٰ سے ایک چھوٹا سا مجموعہ تیار ہو سکتا ہے[2]

---

[1] اعلام الموقعین از ابن قیم ج ۱ ص ۱۲   [2] ایضاً

ان کے بعد باقی تمام صحابہ تیسرے درجے پر آتے ہیں۔ ان سے بہت کم فتاویٰ مروی ہیں۔ حتیٰ کہ ان تمام حضرات کے فتاویٰ کو بھی اگر جمع کیا جائے تو ایک نہایت مختصر سا مجموعہ تیار ہو گا۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ، ام المومنین حضرت صفیہؓ، فاطمہؓ بنت رسول اللہؐ اسی زمرے میں شامل ہیں۔

صحابہ کا طریقِ افتاء و اجتہاد | صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طریقِ افتاء و اجتہاد نہایت واضح اور سیدھا سادہ اور ان ہدایات پر مبنی تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف روانہ کرتے وقت فرمائی تھیں۔ صحابہ نے اس طریقہ کی کس قدر شدت سے پابندی کی۔ اس کی تفصیل ذیل کے مختلف بیانات سے معلوم ہو سکتی ہے۔

خلیفۂ اول کا طرزِ عمل | اس بارے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ جب آپ کے پاس کوئی معاملہ آتا تو اس کا فیصلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے کتاب اللہ میں غور کرتے۔ اگر کتاب اللہ میں حکم مل جاتا تو اسی کے مطابق فیصلہ کرتے، اگر کتاب اللہ میں اس کا کوئی حکم نہ ملتا تو سنتِ نبوی میں غور کرتے۔ اور وہاں حکم مل جاتا تو اُسے مدارِ فیصلہ بنا لیتے۔ اگر ان دونوں سرچشموں میں اس کی رہنمائی نہ ملتی تو عام مسلمانوں سے دریافت فرماتے کہ کیا تم میں سے کسی کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں کوئی فیصلہ صادر فرمایا ہو! بسا اوقات متعدد لوگ آپ کے پاس آتے اور بتاتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں اس طرح فیصلہ فرمایا تھا۔ اگر اس کے بعد بھی رسولِ خدا کا کوئی فیصلہ یا رہنمائی دستیاب نہ ہوتی تو آپ سرکردہ اصحاب کو جمع کرتے اور ان سے مشورہ کرتے۔ اور جس رائے پر ان سب کا اتفاق ہو جاتا اُسی کے مطابق فیصلہ نافذ کر دیتے۔[۱]

خلیفۂ دوم کا طرزِ عمل | یہی طریقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اختیار فرمایا۔[۲] آپ کتاب و سنت سے کسی حکم کو نہ پاتے تو زیرِ بحث قضیہ میں حضرت ابوبکرؓ کا کوئی فیصلہ لوگوں سے دریافت کرتے۔ اگر انہیں حضرت ابوبکرؓ کی کوئی نظیر مل جاتی تو اُسی کو اپنے فیصلے کی بنیاد بنا لیتے ورنہ لوگوں میں سے اہلِ علم افراد کو جمع کرتے اور ان سے مشورہ لیتے۔ اور جس رائے پر وہ متفق ہو جاتے، اسی کو بنائے حکم قرار دیتے۔ یعنی حضرت عمرؓ نے

نئی چیز یہ اختیار کی کہ آپ کتاب اللہ اور سنتِ رسول ؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے فیصلوں کی جانب رجوع کرتے تھے اور اس کے بعد مشورہ اور اجتہاد کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے ایک بار قاضی شُریح کو لکھا: جب تمہارے سامنے کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس میں رائے دینا ناگزیر ہو تو سب سے پہلے کتاب اللہ میں اس کا حکم تلاش کر کے اس کے مطابق فیصلہ کرو۔ کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے مطابق اُسے طے کرو، اگر سنتِ نبوی بھی خاموش ہو تو صالحین اور ائمہ عدل نے جو فیصلے کیے ہوں اُن کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر تمہیں اختیار ہے کہ اگر اپنی رائے سے (فیصلہ تک پہنچنے کی) کوشش کرنا چاہو تو یہ بھی کرسکتے ہو اور اگر مجھ سے مشورہ لینا چاہو تو میں اس میں تمہارے لیے خیر ہی دیکھتا ہوں“

اس بارے میں عبداللہ بن مسعود کی تصریح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اسی طریقے کی تائید میں فرمایا کرتے تھے: ”تم میں سے جس کے سامنے کوئی معاملہ فیصلے کے لیے پیش ہو تو اُسے چاہیے کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے۔ اور اگر ایسا کوئی معاملہ آجائے جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو اس کا فیصلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے مطابق کرے اور اگر معاملہ ایسا ہو کہ اس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ فرمایا ہو تو صالحین نے اس کا جو فیصلہ کیا ہو اس کی پیروی کرے۔ لیکن اگر ایک معاملہ ایسا آجاتے جو نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں، اور نہ صالحین نے اس سے پہلے کبھی اس کا فیصلہ کیا ہو تو اپنی رائے سے (حق وصواب تک پہنچنے کی) پوری کوشش کرے۔ اگر وہ یہ کوشش (اجتہاد) بھی بطریقِ احسن نہ کرسکتا ہو تو اس قضیے سے دستبردار ہو جائے اس میں شرمندگی کی کوئی وجہ نہیں“

عبداللہ بن عباس کا عمل اسی طرح کا طرزِ عمل حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی مروی ہے کہ ”ان سے کسی چیز کے بارے میں جب شرعی حکم پوچھا جاتا تو اگر کتاب اللہ میں ہوتا تو وہی فرما دیتے اور اگر کتاب اللہ کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوتا تو اسی کو بیان کرتے۔ اگر یہ دونوں ماخذ ساکت ہوتے لیکن حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے کسی کا فیصلہ موجود ہوتا تو اسی کو اپنے قول کا ماخذ ٹھہرا لیتے

جب کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اور شیخین کی جانب سے کوئی رہنمائی نہ پاتے تب اجتہاد و قیاس کا طریقہ اختیار کرتے۔

اصولِ قضا پر حضرت عمرؓ کا تاریخی ہدایت نامہ | علیٰ ہذا القیاس صحابہ کرام میں سے جو حضرات بھی قضاء اور افتاء کی مسند پر سرفراز ہوئے ہیں وہ اپنے قول میں اور اپنے عمل میں اسی مذکورۂ بالا طریقے پر کاربند رہے ہیں۔ ان تمام حضرات کے اقوال و اعمال نقل کرنے کے بجائے ہم یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ مکتوب درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو انہوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعری والیٔ یمن کو تحریر فرمایا تھا۔ خلیفۂ ثانی کا یہ مکتوب ہر دور میں علماء و قضاۃ کے لیے مینارِ ہدایت رہا ہے۔ اور تمام اصولِ قضاء اور شہادت کے ضابطے اسی اصل پر استوار کیے جاتے رہے ہیں۔

امام ابن قیمؒ اعلام الموقعین میں ابوالعوام سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعری کو لکھا: امابعد،

کتاب و سنت قضاء کے ماخذ ہیں | "بے شک قضاء ایک محکم فرض اور واجب الاتباع سنت ہے۔ پس جب کوئی فیصلہ طلب معاملہ تیرے سامنے آئے تو خوب غور و خوض سے کام لے۔ کیونکہ جو فیصلہ ناقابلِ نفاذ ہو اس کے بارے میں منہ سے کچھ کہنا بے سود ہوتا ہے۔"

مساوات | "مجلس عدالت میں، پیشی میں اور اپنے فیصلے میں لوگوں کے ساتھ یکساں سلوک کر تاکہ کوئی ذی وجاہت تجھ سے ناانصافی کا لالچ نہ رکھے اور کوئی کمزور تیری عدل گستری سے مایوس نہ ہو۔"

ثبوت اور قسم | "ثبوت (بیّنہ) فراہم کرنا مدّعی کے ذمہ ہے اور قسم (یمین) فریقِ مخالف پر"

شرائط صلح | "مسلمان کے درمیان صلح کرا دینا جائز ہے۔ مگر وہ صلح جائز نہیں ہے جو حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرا دے۔"

غلط اجتہاد سے رجوع | "آج اگر تو کسی مقدمہ کا فیصلہ کر دیتا ہے، اور پھر اس فیصلہ پر

نظرِ ثانی کرتا ہے اور اس میں تجھے (سابق فیصلے کے برخلاف) وجہِ صواب مل جاتی ہے تو یہ وجہِ صواب اختیار کرنے میں تجھے سابق فیصلہ پر اصرار مانع نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ حق کو اولیت حاصل ہے۔ اُسے کوئی چیز باطل نہیں کر سکتی۔ پس حق کی جانب مراجعت کر لینا باطل میں ڈھکتے رہنے سے بہتر ہے۔"

ضابطۂ شہادت | "تمام مسلمان عدول ہیں۔ باہم گواہی دے سکتے ہیں۔ مگر اس شخص کی گواہی نہیں قبول کی جائے گی جس سے پہلے جھوٹی گواہی کا تجربہ ہو چکا ہو، یا اس پر کسی حد کا نفاذ ہو چکا ہو، یا اس کے بارے میں یہ گمان ہو کہ وہ گواہی میں رشتہ داری یا دوستی کا لحاظ کر جائے گا۔"

عدلیہ کی دخل اندازی کی شرائط | "اللہ تعالیٰ نے بندوں کے پوشیدہ رازوں کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ حدود کے واجب کر دینے والے جرائم پر اس نے پردہ ڈالا ہوا ہے۔ یہ پردہ ثبوت اور یمین کے ذریعے ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔"

قیاس اور رائے کی اجازت | "اگر کوئی ایسا مقدمہ تیرے سامنے آئے جس کے بارے میں قرآن اور سنت میں رہنمائی نہ ملتی ہو تو اس میں خوب غور و فکر کر، اس سے ملتے جلتے منصوص احکام تلاش کر کے ان پر قیاس کر اور اسی پہلو کو اختیار کر جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور حق سے زیادہ قریب نظر آئے۔"

مجلسِ عدالت میں قاضی کے فرائض | "مقدمہ کے وقت غیظ و غضب، قلق (ایسی برافروختگی جو انسان پر صحیح فیصلہ تک پہنچنے کا دروازہ بند کر دیتی ہے) اور اکتاہٹ سے احتراز کر، لوگوں سے تنگ دل نہ ہو، ناپسندیدگی کا اظہار نہ کر۔ بے شک ایسے مواقع پر قضا کا کام سرانجام دینا جہاں حق تقاضا کر رہا ہو (یعنی ایسے مقدمات میں جن میں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہوتا ہو) اللہ کے نزدیک اجر کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ اور نیک نامی بھی حاصل ہوتی ہے۔ جو شخص بہ نیتِ خالص امرِ حق اختیار کرتا ہے، چاہے اُس کی زندگی کے

اپنے اوپر پڑتی ہو، تو خلقِ خدا کے ساتھ اُس کا جن معاملات میں سابقہ درپیش ہے اُن میں اللہ تعالیٰ اُس کی مدد کرتا ہے۔ جو شخص جھوٹی زینت اختیار کرے گا اللہ اسے بدنما کریگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے خالص اور بے آمیزش اعمال کے ماسوا کوئی عمل قبول نہیں فرماتا۔ کجا یہ کہ تو (غیر خالص اور ریاکارانہ اعمال پر) (دنیا میں) نقد روزی اور (آخرت میں) رحمت کے بے پایاں خزانوں کی صورت میں اللہ تعالیٰ سے ثواب کا خیال باندھے والسلام"

اجتہاد کی تین قسمیں الغرض اسی مذکورہ طریقہ کی روشنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تلامذہ کرام فتاویٰ جاری کرتے تھے اور مقدمات کا تصفیہ کرتے تھے اور پیش آمدہ مسائل میں قیاس و اجتہاد کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے تھے۔ اجتہاداتِ صحابہ کا جب ہم تتبع اور استقرا کرتے ہیں تو ان کے تمام اجتہادات ہمیں تین قسموں پر مشتمل نظر آتے ہیں:

اولاً ۔ کتاب و سنت کے احکام کی تعبیر۔

ثانیاً ۔ کتاب و سنت کے مماثل اور مشابہ احکام پر ان کے احکام کا قیاس۔

ثالثاً ۔ رائے ۔ جو کسی ایک مخصوص نص پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کا مدار پورے نظامِ شریعت میں جاری و ساری رُوح پر ہے۔ اور وہ روح عبارت ہے ان اصولوں سے کہ "مصلحت ہی منشائے شریعت ہے" ۔ "مصلحت کا جو تقاضا ہوگا شریعتِ الٰہی کا وہی منشاء ہوگا" ۔ "مسلمانوں کے نزدیک جو مستحسن ہے اللہ کے نزدیک بھی مستحسن ہے"۔

تین قسموں کی مثالیں چنانچہ ہم ذیل میں اجتہاد کی اقسام سہ گانہ کی مزید وضاحت کے لیے اور قاری کو صحابہ کے طرزِ اجتہاد سے متعلق صحیح نقطۂ نظر سے روشناس کرانے کے لیے تینوں طریقوں کی ایک ایک مثال درج کرتے ہیں۔ ان مثالوں میں قاری کو معلوم ہوگا کہ اُمتِ مسلمہ کے گروہِ اوّل کے فہم و قیاس کا کیا ڈھب تھا۔ اور اپنے اجتہادات میں اُس نے مصلحت جزئی اور منشائے شریعت کی تکمیل میں کس قدر اعتدال اور شدت سے کام لیا ہے۔

قسم اوّل اور قسم ثالث کی جامع مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد، دورِ صحابہ میں سب سے اہم اور نمایاں جو اجتہادی مسئلہ پیدا ہوا وہ عراق و شام و مصر کے مفتوح علاقوں کی زمینوں کی تقسیم کا

مسئلہ تھا قرآن کریم کا نہایت صریح حکم ہے کہ مالِ غنیمت کا خمس بیت المال میں جائے گا اور ان مدات میں صرف کیا جاتے گا جن کی تصریح خود قرآن نے کر دی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ	اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مالِ غنیمت تم نے حاصل
فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي	کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ	اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں
السَّبِيْلِ (الانفال)	کے لیے ہے۔

باقی چار حصے ان سب لوگوں میں بانٹ دیئے جائیں جنہوں نے جہاد میں حصہ لیا ہے مذکورہ آیت کے مفہوم کا بھی یہی تقاضا ہے اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی منقول ہے کہ آپ نے خیبر کے غنائم کو مجاہدین کے اندر تقسیم فرما دیا تھا۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب عراق و شام کے علاقے فتح ہوئے تو وہاں کی زمینوں کی تقسیم کے لیے مجاہدین آپ کے پاس آئے اور مذکورہ قرآنی نص اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تحت آپ سے مطالبہ کیا کہ ان زمینوں میں سے خمس بیت المال اور مذکورہ آیت میں بیان کردہ اغراض کے لیے وضع کر لیا جائے اور باقی ⅘ فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو جواب میں فرمایا:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں زمین ان لوگوں میں تقسیم کر دوں اور بعد کے آنے والے مسلمانوں کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ ان کا اس میں کچھ حصہ نہ ہو۔ کیا بعد میں آنے والی نسلیں آ کر یہ دیکھیں کہ زمین ایک محدود طبقہ میں تقسیم ہو چکی ہے اور اسی طبقہ میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہو رہی ہے؟ میں اس رائے کو درست نہیں سمجھتا ہوں۔"

خلیفۂ ثانی کا جواب سن کر حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے فرمایا:

"اور کونسی رائے ہو سکتی ہے؟ یہ مفتوحہ زمین اور اس کے مالک مالِ غنیمت ہی ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے لشکرِ اسلام کو دلوایا ہے۔"

حضرت عمرؓ نے اپنے خیال کی مزید صراحت کرتے ہوئے عبدالرحمان بن عوف سے فرمایا:

"یہ آپ کا خیال ہو سکتا ہے۔ میں اس خیال کے حق میں نہیں ہوں۔ خدا کی قسم میرے بعد اسلامی فتوحات میں جو علاقہ بھی آئے گا اُس سے اس کثیر مقدار میں مال ہاتھ نہیں لگ سکے گا۔ بلکہ ممکن ہے آئندہ فتوحات مسلمانوں کے لیے مالی بوجھ بنتی رہیں۔ اس لیے اگر میں اراضی شام اور ان کے کاشتکار اور اراضی مصر اور ان کے کاشت کار تمہارے درمیان تقسیم کردوں تو پھر سرحدوں کی حفاظت کس مال سے کی جائے گی؟ اور اس علاقے اور اس کے علاوہ شام اور عراق کے یتیم بچوں اور بیواؤں کی کفالت کہاں سے ہوگی؟"

حضرت عمرؓ کے اس جواب پر مطالبہ کرنے والوں نے متعدد اعتراضات کیے اور کہنے لگے "کیا جس مال کو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہماری تلواروں کے ذریعے سے دیا ہے آپ اُسے ان لوگوں کے لیے، اور ان لوگوں کے بچوں اور پوتوں کے لیے مختص کرنا چاہتے ہیں جو اس وقت موجود نہیں ہیں اور جو جنگ میں شریک نہیں ہوئے ہیں؟ کیا ان کے خیال سے ہماری حق تلفی کرنا چاہتے ہیں؟"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے اعتراضات پر اس کے سوا کچھ نہیں فرماتے تھے کہ ھٰذا رائی (میری رائے یہی ہے)۔ ان لوگوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ اس قضیے میں اہلِ شوریٰ اور عام صحابہؓ سے مشورہ کریں۔ چنانچہ آپ نے اوّلاً مہاجرین سے اس معاملے میں گفتگو فرمائی۔ مہاجرین نے مختلف رائیں دیں (یعنی بعض نے آپ سے اتفاق کیا اور بعض نے اختلاف)۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی رائے یہ تھی کہ جن کی تلواروں نے ملک فتح کیا ہے انہی کو قبضہ کا بھی حق ہے۔ حضرت عثمانؓ طلحہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کی رائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے موقف کی تائید میں تھی

مہاجرین کے بعد آپ نے مشورہ کے لیے انصار کی جانب رجوع فرمایا اور انصار کے دس ممتاز اور سرکردہ آدمیوں ـــ پانچ قبیلہ اوس میں سے اور پانچ خزرج میں سے ـــ کو بلا بھیجا۔ جس وقت یہ تمام جمع ہوئے، آپ نے حمد و ثنا کے بعد ان کے سامنے یہ تقریر کی:

"میں نے آپ حضرات کو محض اس لیے زحمت دی ہے کہ جس بارِ امانت کو میرے سپرد کیا گیا ہے اور جن معاملات کی ذمہ داری آپ لوگوں نے مجھ پر لادی ہے اس کے اٹھانے میں میری مدد کریں۔ اس لیے کہ میں بھی آپ ہی لوگوں جیسا ایک آدمی ہوں۔ آج آپ لوگوں کو ایک حق بات کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس فیصلہ میں کچھ لوگوں نے میری مخالفت کی ہے اور کچھ نے موافقت کی ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری مرضی اور خواہش کی اتباع کریں (اور میری خاطر حق بات کو چھوڑ دیں)۔ آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب موجود ہے جو خود حق واضح کر دے گی۔ بخدا! اس بارے میں جو کچھ کہوں گا اس کا مقصود اظہارِ حق کے سوا کچھ نہ ہوگا اور اپنی رائے کو بزور مسلط کرنا میرے پیش نظر نہ ہوگا"

تمام حاضرین نے بیک زبان ہو کر کہا "امیر المومنین! آپ ارشاد فرمائیے، ہم آپ کی بات کو غور سے سنیں گے" چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس تمہید کے بعد فرمایا:

"آپ لوگوں نے سنا ہوگا کہ جو لوگ سوادِ عراق کی تقسیم کے حامی ہیں اُن کا خیال ہے کہ میں ان کے حقوق چھین کر ان پر ظلم کر رہا ہوں۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ کسی کے معاملے میں ظلم کا مرتکب ہوں۔ اگر میں کوئی ایسی چیز، جو ان کی ملکیت میں ہوتی اور جس پر ان کا حق قائم ہوتا، ان سے چھین کر دوسروں کو دے دیتا تو بے شک یہ میری بدبختی ہوتی۔ لیکن اصل صورت یہ ہے کہ میں غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ارضِ کسریٰ فتح ہو جانے کے بعد کوئی ایسا بڑا علاقہ نہیں رہا جس کی فتح سے اموالِ کبیرہ حاصل ہوں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے کسریٰ کے اموال، ان کی زمینیں اور زمینوں کے کاشت کار ہمیں غنیمت میں عطا فرما دیئے ہیں۔ جہاں تک اموال (منقولہ) کا تعلق ہے، وہ میں نے مجاہدین کے درمیان تقسیم کر دیئے ہیں۔ ان میں سے خمس نکال لیا ہے اور اُسے مطلوبہ اغراض میں صرف کر دیا ہے اور تا حال صرف کر رہا ہوں، باقی رہیں زمینیں، تو ان کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ (مصالح عامہ اور جہاد وغیرہ

کی خاطر انہیں تقسیم سے روک لوں اور اصل کاشت کاروں کے ہاتھ میں رہنے دوں۔ ان پر فقط جزیہ اور خراج عائد کر دیا جائے تاکہ اس سے جو آمدنی ہو اُس سے فوجیوں معصوم بچوں اور بعد میں آنے والی نسل سب کو فائدہ پہنچایا جائے۔

" کیا آپ لوگوں نے اس پر غور کیا ہے کہ یہ مملکت اسلامی کی وسیع سرحدیں ہیں، جن کی حفاظت کے لیے ایک مستقل فوج کی ضرورت ہے۔ یہ اسلامی سلطنت کے بڑے بڑے وسیع خطے اور شہر مثلاً شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ، مصر ہیں۔ ان کے اندر بھی حفاظت کے لیے کثیر تعداد میں فوج متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے تنخواہوں اور وظائف کا انتظام کرنا پڑے گا۔ اگر میں یہ زمینیں ان کے مالکوں سمیت فوجیوں میں تقسیم کر دوں تو اتنی بڑی فوج کے مصارف کہاں سے پورے ہوں گے؟"

یہ تقریر سن کر تمام انصار نے متفقہ طور پر اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا:

" آپ کی رائے بالکل بجا اور آپ نے جو کچھ فرمایا اور جس ضرورت کا احساس کیا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ فی الواقع اگر اسلامی سرحدوں اور اسلامی شہروں کی کثیر افواج سے حفاظت نہ کی گئی اور ان کے لیے حکومت کی طرف سے روزینے جاری نہ کیے گئے تو خدشہ ہے کہ کفار دارالکفر کی طرف رجوع کر جائیں گے۔"

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجلسِ عام کے اتفاق سے اپنا فیصلہ صادر کر دیا اور فرمایا:

" اللہ کی توفیق سے، میرے فیصلے کی صحت مجھ پر واضح ہو گئی ہے۔ اب ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو سوادِ عراق کی پیمائش کر کے قابلِ زراعت اراضی کا بندوبست کرے اور کاشتکاروں پر ان کے مناسبِ حال لگان تشخیص کرے۔"

لوگوں نے حضرت عثمان بن حنیفؓ کا نام پیش کیا کہ زمین کے معاملات میں انہیں خاص سوجھ بوجھ ہے اور عملی تجربہ بھی رکھتے ہیں اس لیے اس مہم پر ان کا مقرر کیا جانا مناسب رہے گا۔ حضرت

عمرؓ نے بلا تاخیر حضرت عثمان بن حنیف کو طلب فرمایا اور سوادِ عراق کی پیمائش کا کام ان کے سپرد کر دیا۔

اسی فیصلے کی اساس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے متعدد مقامات کی مفتوحہ اراضی کو فاتحین کی جاگیر میں دینے کے بجائے اصل کاشتکار آبادی کے پاس چھوڑ دیا اور اس کو ذمی بنا کر اس پر خراج نافذ کر دیا۔ چنانچہ شام اور مصر کی زمینوں کے بارے میں یہی اصول اختیار کیا گیا۔ مصر کی زمینوں کے بارے بھی زبیر بن عوامؓ اور عمرو بن العاص امیرِ مصر کے درمیان اسی نوعیت کا تنازعہ برپا ہوا تھا جس طرح کا سوادِ عراق کے بارے میں ہم نقل کر آئے ہیں۔ مگر حضرت عمرؓ نے وہاں بھی عدمِ تقسیم اور خراج لگانے کا حکم دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد میں صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ ان کا یہ اجتہاد قرآن و سنت کے نصوص کا بیان اور تعبیر تھا۔ اور انہوں نے اختلافِ رائے رکھنے والوں پر زور دیا کہ وہ بھی نصوصِ شریعت کو اجتماعی مصلحت — جو شریعت کا اصل منشا ہے اور جس پر انسانوں کی صلاح و فلاح کا مدار ہے — کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

قاضی ابو یوسفؒ حضرت عمرؓ کے فیصلے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیقِ خاص سے قرآنِ حکیم کا منشا منکشف فرمایا اور انہوں نے مجاہدین اور فاتحین کے درمیان مفتوحہ اراضی تقسیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا یہ فیصلہ بالکل صحیح تھا، اسی میں تمام مسلمانوں کی بہتری تھی اور ان کی یہ رائے کہ ایسی زمینوں سے خراج حاصل کر کے اجتماعی ملکیت قرار دے دیا جائے اسلامی جماعت کے عمومی مصالح کی حامل تھی، اس لیے کہ اگر مفتوحہ زمینیں وقفِ عام کر کے کارکنوں کے لیے تنخواہوں اور روزینوں کا انتظام نہ کر لیا جاتا تو نہ تو اسلام کی سرحدوں کی حفاظت ہو سکتی تھی اور نہ سلسلۂ جہاد کو جاری رکھنے کے لیے فوجی قوت حاصل ہو سکتی تھی۔"

اراضیٔ عراق کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کی مذکورہ بالا مثال بیک وقت اجتہاد کی دو قسموں پر روشنی ڈالتی ہے۔ ایک قسم اوّل جس میں اجتہاد نصوصِ شریعت کی تفسیر و بیان سے عبارت ہے

اور دوسری قسم ثالث جس میں اجتہاد کی اساس رُوحِ شریعت پر استوار ہوتی ہے۔

قسمِ ثانی کی مثال رہا دوسری قسم کا اجتہاد جس میں کتاب و سنت کے نظائر پر نئے احکام قیاس کیا جاتا ہے، تو اس کی مثال توریثِ جدّہ والے مسئلے میں موجود ہے۔ سنت میں نانی کا جو حصّہ وارد ہے فقہائے صحابہ نے اُسی پر قیاس کر کے دادی کا حصّہ مقرر کیا ہے، بلکہ دادی کو بطریقِ اولیٰ اس حصّے کا حقدار ٹھہرایا ہے۔

اس کی پوری تفصیل علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں بیان کی ہے۔ موصوف رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ایک بار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک متوفی کی دادی اور نانی ترکہ کا دعویٰ لے کر آئیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے نانی کو توورائت میں سے حصّہ دلوا دیا مگر دادی کو محروم کر دیا۔ انصار کے قبیلۂ بنی حارثہ میں سے ایک شخص نے جسے عبدالرحمان بن سہل کہا جاتا تھا، حضرت ابوبکرؓ سے کہا: اے رسولِ خدا کے نائب! آپ نے اُسے میراث کا حقدار ٹھہرا دیا ہے جس کے مرنے کے بعد کوئی اس کا وارث نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور میراث میں نانی اور دادی دونوں کو حقدار قرار دیا۔ اس لیے کہ یہ سراسر غیر معقول بات ہے کہ ہم نانی کو تو اس کے نواسوں اور نواسیوں کے ترکہ میں سے حق دلا دیں حالانکہ نواسوں اور نواسیوں کا نانی کے ترکہ میں کوئی حق نہیں ہے۔ اور اُدھر دادی کو ہم پوتوں اور پوتیوں کے ورثے سے محروم کر دیں حالانکہ پوتے اور پوتیاں دادی کے ترکے میں سے حصہ پائیں۔ معقول صورت یہی ہے کہ جب سنت نے نانی کو وارث ٹھہرایا ہے تو اسی پر قیاس کر کے دادی کو بھی ورثاء میں شامل کر دیں ــــ بلکہ دادی کو بطریقِ اولیٰ وراثت میں سے حصّہ پانا چاہیے۔"

مصلحی اجتہاد کی وسعت و اہمیت اجتہاد کا تیسرا طریقہ وہ ہے جو رائے اور قیاس پر استوار ہوتا ہے اور اس میں کسی مخصوص نص کو مدِ نظر رکھ کر احکام کا استنباط نہیں ہوتا بلکہ پوری شریعت کی رُوح کو اور عمومی مصلحت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یہ طریقہ نظامِ اجتہاد اور قانون سازی میں بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میدان میں اربابِ نظر کے نہایت جلیل القدر کارنامے سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ یہ درست نہ ہوگا

کہ ہم یہ معلوم کیے بغیر آگے نکل جائیں کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تلامذہ عظام اور خلفائے کرام کی نظروں میں اس طریقۂ اجتہاد کی کیا قدر و قیمت تھی؟ اور وہ دین کے فہم اور احکام دین میں وقیقہ رسی کا اسے کس حد تک ذریعہ تصور کرتے تھے؟

یہاں ضمناً یہ بھی واضح کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ یہی طریقۂ اجتہاد بعد کے ادوار میں ان تمام مسائل و احکام پر شامل تھا اور انہیں جنم دینے کا موجب ہوا جو مالکیہ کے نزدیک مصالحِ مرسلہ کے نام سے موسوم تھے اور حنفیہ کے ہاں استحسان کی اصطلاح سے مشہور تھے (تفصیلات آٹھویں اور نویں باب میں آئیں گی)

مصالحِ مرسلہ سے مراد وہ اجتماعی مصلحتیں (PUBLIC-GOOD) ہیں جن کی رعایت کے لیے اگرچہ کوئی مخصوص نص وارد نہیں، لیکن عمومی طور پر انہیں شریعت نے قانون سازی میں ملحوظ و معتبر رکھا ہے اور ان کا دار و مدار شریعت کے اصولِ عامہ اور قواعد کلیہ پر ہے جو اس نوعیت کی مصلحتوں کو ملحوظ رکھنے کے متقاضی ہوتے ہیں۔ استحسان یہ ہے کہ مجتہد کسی زیرِ بحث مسئلہ کو اس کے نظائر کے حکم سے خارج کرکے کسی دوسرے حکم میں داخل کر دیتا ہے، اس عدول کے لیے اس کے سامنے کوئی ایسی قوی تر وجہ ہوتی ہے جو مسئلے کو دوسرے حکم کی طرف راجع کرنے کی متقضی ہوتی ہے۔ اس "قوی تر وجہ" کی تہ میں بھی دراصل ان مصالح کی حمایت مقصود ہوتی ہے جن کی شریعت حمایت کرتی ہے اور اس منشائے شریعت کی بوجوہ احسن تکمیل ہوتی ہے جسے "مصلحت" کہا جاتا ہے۔

اسلام نے صحابہ کے اندر مصلحتِ انسانی کی حمایت کا جو تصور اور ولولہ پھونک رکھا تھا اس کی وجہ سے اس جلیل القدر گروہ کے ذہن و قلب پر زیادہ تر مصلحی اجتہاد کا غلبہ تھا اور ان کے فہم و ذوق پر اسے غیر معمولی کارفرمائی حاصل تھی۔

مصلحی اجتہاد کی مثالیں چنانچہ ابھی ابھی ہم مفتوحہ اراضی کی تقسیم کے مسئلے میں حضرت عمرؓ اور فاتحین عراق اور ان کے حامی صحابہ کا جو مباحثہ نقل کرکے آئے ہیں وہ مصلحی اجتہاد کی بہترین مثال ہے۔ مجاہدین اور ان کے حامی قرآن کے ظاہری حکم کی بنیاد پر تمام اموالِ غنیمت کو $\frac{4}{5}$ (فوجیوں کے لیے) اور $\frac{1}{5}$ (بیت المال کے لیے) کے فارمولے کے تحت تقسیم کر دینے کے حق میں تھے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

ملک کی دفاعی ضرورت کو پیش نظر رکھا ان کا خیال تھا کہ دفاع کے لیے مستقل آمدنی کے بغیر چارہ نہیں اور یہ اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے جب کہ تمام مفتوحہ زمینوں کو بحق بیت المال محفوظ کر لیا جائے۔ اور چونکہ دفاع ملک ایک ایسی اجتماعی مصلحت ہے جس کی حفاظت و رعایت ہر دوسری چیز پر فوقیت رکھتی ہے اس لیے آیت مذکورہ کا اطلاق اموال منقولہ تک محدود رکھا جائے۔ اور غیر منقولہ اموال ــــ اراضی ــــ کو اس کے مفہوم میں شامل نہ سمجھا جائے۔ الغرض یہ پوری بحث اور اس کا انداز اور مصلحت کے تصور پر مبنی رائے ہمارے سامنے مصلحی اجتہاد یا اجتہاد بالرائے کی عمدہ ترین مثال پیش کرتی ہے۔

غیر مناسب نہ ہوگا اگر ہم قارئین کے سامنے اسی طریقۂ اجتہاد کی ایک اور مثال یہاں نقل کر دیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض چراگاہیں ان کے مالکوں سے ضبط کر کے انہیں فوج کے گھوڑوں کے لیے وقف کر دیں خلیفۂ راشد کے اس تصرف پر چراگاہوں کے مالک بڑے برافروختہ ہوئے اور حضرت عمرؓ کے پاس آکر ان کے تصرف پر شدید احتجاج کیا۔ ابو عبید ابن سلام نے کتاب الاموال میں اس واقعہ کی جو روداد نقل کی ہے اس کے مطابق ایک اعرابی نے حضرت عمرؓ کے سامنے ہو کر کہا: امیر المومنین! یہ ہمارے وہ علاقے ہیں جن کی خاطر جاہلیت میں ہمارے درمیان تلوار چلتی رہی ہے۔ اسلام لانے کے بعد بھی یہ علاقے ہمارے پاس رہے۔ اب آپ کس حق کی بنا پر ان کو ہمارے ہاتھ سے چھین رہے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے یہ اعتراض سن کر سر نیچے ڈال لیا اور مونچھوں کو بل دینے اور زور زور سے سانس لینے لگے ــــ حضرت عمرؓ کی عادت تھی کہ جب کسی تکلیف دہ بات سے دوچار ہوتے تو مونچھوں کو بل دینے لگتے اور زور زور سے سانس لینے لگتے ــــ اعرابی نے حضرت عمرؓ کو حالتِ تفکر میں دیکھ کر اپنی بات کو بار بار دہرانا شروع کر دیا: بالآخر حضرت عمرؓ نے قرآن یا سنت نبوی سے کسی سند کو تلاش کیے بغیر صرف نظریۂ مصلحت پر اعتماد کرتے ہوئے اعرابی کو جواب دیا:

المال مال اللہ، والعباد عباد اللہ	یہ سب اللہ کا مال ہے۔ یہ لوگ سب اللہ کے بندے ہیں خدا کی قسم!
واللہ لولا ما احمل علیہ فی سبیل اللہ	اگر مجھے اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے ان کا انتظام نہ کرنا ہوتا تو میں ایک
ما حمیتُ من الارض شبراً فی شبر	مربعہ بالشت جگہ بھی سرکاری چراگاہ کے لیے نہ لیتا۔